ماہنامہ

اِنذار

جولائی 2017ء

مدیر
ابو یحییٰ

دین میں گہری سمجھ پیدا کرنے سے پہلے
دین کے بارے میں کلام کرنا
ایسا ہی ہے جیسے کوئی نابینا شخص
لوگوں کو راستہ دکھانے کھڑا ہو جائے

www.inzaar.org

ماہنامہ
اِنذار
جولائی 2017ء شوال 1438ھ
جلد 5 شمارہ 7

ابو یحییٰ کے قلم سے

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

وٹامن ڈی اور مشکلات

دنیا بھر میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص وٹامن ڈی کی کمی کا بہت ذکر ہوتا ہے۔اس کی کمی کی وجہ سے ہڈیاں کمزور ہوجاتی ہیں اور جسم میں درد رہتا ہے۔ چنانچہ ڈبہ بند دودھ فروخت کرنے والی بہت سی کمپنیاں انتہائی مہنگے داموں اپنا دودھ اس دعوے کے ساتھ فروخت کرتی ہیں کہ دودھ میں وٹامن ڈی بھی شامل ہے۔ جبکہ ڈاکٹر ایسے مریضوں کو وٹامن ڈی کے انجیکشن تجویز کرتے ہیں۔

تاہم بہت کم لوگوں کو یہ حقیقت معلوم ہے کہ وٹامن ڈی ہر روز بلا معاوضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے۔ ہمارے سر پر چمکتا سورج وٹامن ڈی کے حصول کا سب سے آسان اور قدرتی ذریعہ ہے۔ دن کے اس تمام وسطی حصے میں جب ہمارا سایہ ہمارے قد سے چھوٹا، برابر یا قدرے بڑا ہوتا ہے، ہماری جلد براہ راست سورج کے سامنے ہونے پر خودبخود وٹامن ڈی بنانے لگتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری جلد کو اس وٹامن ڈی کو اسٹور کرنے کی بیٹری بھی بنا رکھا ہے۔ یعنی یہ وٹامن ڈی کو اپنے اندر جمع رکھتی ہے اور ضرورت پڑنے پر جسم کو فراہم کر دیتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ دن کا کچھ حصہ سورج کی روشنی میں اس طرح گزارتے ہیں کہ وہ ان کی جلد پر براہ راست پڑتی رہے، وہ کبھی وٹامن ڈی کی کمی کا شکار نہیں ہوتے۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ خدا کی دنیا میں ہر مشکل کے ساتھ خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے۔ سورج کی دھوپ اور تپش کوئی پسند نہیں کرتا۔ بہت سے لوگ رنگ کالا ہوجانے کے خوف سے دھوپ سے بھاگتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ دھوپ جو بظاہر جلد کو گہرا کر رہی ہوتی ہے، دراصل ہڈیوں کو طاقتور بنانے اور صحت مند رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

یہی ہر مشکل کا سامنا کرنے کا اصول ہے۔ ہر مشکل جو بظاہر ہمارا ''رنگ'' جلاتی ہے دراصل ہماری ''ہڈیاں'' مضبوط کرتی ہے۔ یہ سبق یاد رہے تو انسان کسی مشکل میں مایوس نہیں ہوتا۔

وٹامن ڈی اور عجیب انسان

وٹامن ڈی ہڈیوں کو مضبوط بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ سورج ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وٹامن ڈی کی زیادتی خود صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کے نتیجے میں بھوک کی کمی سے لے کر گردوں کی بیماری تک جیسے مسائل کا سامنا ہوسکتا ہے۔

ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ مستقل سورج میں رہتے ہیں، ان میں وٹامن ڈی کی زیادتی کیوں نہیں ہوتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانی جلد ضرورت پوری ہونے پر وٹامن ڈی بنانا بند کر دیتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے یو پی ایس سے منسلک بیٹری خالی ہونے پر بھرتی رہتی ہے اور جیسے ہی بیٹری بھر جاتی ہے سسٹم بجلی بھرنا بند کر دیتا ہے۔ انسانی جلد یہی کام کرتی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ بیٹری ہر تھوڑے عرصے بعد خراب ہوتی رہتی ہے اور انسانی جلد بغیر خراب ہوئے ساری زندگی یہ کام کرتی رہتی ہے۔

انسانی جلد میں ہونے والا یہ عمل ان بے گنتی مظاہر میں سے ایک ہے جو اس کرہ ارض پر زندگی اور خاص کر انسانی زندگی کو ممکن بناتے ہیں۔ آج کے انسان نے ہر دور سے بڑھ کر ان عجیب و غریب مظاہر کو دریافت کرلیا ہے جو زبان حال سے پکار کر یہ بتا رہے ہیں کہ یہ کارخانہ ایک حکیم و علیم رب کی قدرت اور ربوبیت کا شاہکار ہے۔

مگر عجیب المیہ ہے کہ آج کا انسان ہر دور سے بڑھ کر اپنے اس خالق اور مالک کو بھولا ہوا ہے۔ یہ انسان خدا کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ انسان اس کی شکرگزاری کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ انسان اس کے حکم کے سامنے اپنے تعصّبات اور خواہشات کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ کیسا عجیب ہے یہ انسان اور کیسی عجیب ہے اس کی یہ بے حسی۔

ٹیسٹ میچ اور انسانی زندگی

ٹیسٹ میچ کرکٹ کی ایک ابتدائی شکل ہے جو پہلے ون ڈے اور پھر ٹی ٹونٹی کے متعارف ہونے کے بعد زیادہ مقبول نہیں رہی۔ تاہم عوامی مقبولیت سے قطع نظر کرکٹ کا کھیل اپنی کلاسیکل شکل میں ٹیسٹ کرکٹ ہی کا نام ہے جو کسی کھلاڑی کے مزاج (temperament) اور معیار کو پرکھنے کی اصل کسوٹی بھی ہے۔ اس پانچ روزہ کھیل میں ہر کھلاڑی کے پاس کافی وقت ہوتا ہے سوائے ان کے جو کمزور لمحوں کا شکار ہو کر غلط گیند پر شاٹ لگاتے ہوئے آؤٹ ہو جائیں۔

انسان زندگی کے جس کھیل کا حصہ ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ٹیسٹ میچ ہی ہے۔ اس ٹیسٹ میچ کی طویل اننگز میں انسان کا مزاج اور معیار حقیقی معنوں میں پرکھا جاتا ہے۔ بیشتر انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، لیکن انسان کا دشمن شیطان اس حقیقت کو خوب سمجھتا ہے۔ وہ انسان کے کمزور لمحوں کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ جیسے ہی کمزور لمحہ آئے اور انسان غلط شاٹ لگائے وہ انسان کو فوراً آؤٹ کر دیتا ہے۔

تاہم عقلمند لوگ کبھی اس طرح آؤٹ ہونے پر مایوس نہیں ہوتے۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کے ٹیسٹ میں ہمیشہ دوسری اننگز بھی آتی ہے۔ چنانچہ وہ فوراً توبہ کرکے دوسری اننگز کھیلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر نادان لوگ ایک یا کچھ ناکامیوں کے بعد دلبرداشتہ ہو جاتے ہیں۔ وہ مایوس ہو کر خدائے رحمان کی ٹیم سے نکل کر شیطان کی ٹیم میں چلے جاتے ہیں۔

زندگی کے اس ٹیسٹ میچ کی ایک اور کمزوری جلد بازی ہے۔ ٹیسٹ میچ کی طرح زندگی میں بھی جلد بازی خطرناک ہوتی ہے۔ اس میں کامیابی کی شرط جلد بازی اور تیز رفتاری نہیں بلکہ مستقل مزاجی ہوتی ہے۔ جو شخص مستقل مزاج ہو وہ زندگی کا ٹیسٹ کبھی نہیں ہار سکتا۔ ایسا شخص درخت کی طرح آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور آخر کار اپنا وجود منوا کر دم لیتا ہے۔

بدنصیب دور

انسانی تاریخ کے بعض ادوار بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ یہ بدنصیبی ملائکہ کے اس اندیشے کا ظہور نہیں ہوتی جو انھوں نے مسجود ملائک کے بارے میں ظاہر کیا تھا۔ ”پروردگار! کیا تو اسے زمین پر خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔“ انسان نے تو ہر دور میں خون بہایا ہے۔ بدنصیب دور وہ ہوتے ہیں جن میں بے گناہوں اور نہتے لوگوں کا خون بہانے کے عمل کو خدا کے نام پر کھڑے لوگ اگر اور مگر کی ڈھال سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

آج ہم ایسے ہی ایک بدنصیب دور میں کھڑے ہیں۔ اس بدنصیب دور میں آسمان نے اہل مذہب کے فتوے دیکھ لیے۔ زمین نے ان کی تقریریں سن لیں۔ فرشتوں نے قتل اور قاتلوں کی حمایت میں کیا گیا ہر فریب لکھ لیا۔ شیطان ان کی فنکارانہ تاویلوں پر انھیں داد دے چکا۔ سوال یہ ہے کہ جس کے نام پر کھڑے ہو کر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے کیا وہ خاموش رہے گا؟ جواب یہ ہے کہ نہیں خدا کبھی خاموش نہیں تھا۔ اس نے تو پہلے دن ہی اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔

لوگ جس خدا کے نام پر کھڑے ہو کر یہ سب کرتے ہیں وہ پہلے دن ہی کہہ چکا ہے کہ جس نے ایک انسان کو قتل کیا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ وہ ایک مسلمان کے قتل پر اپنے غضب، لعنت اور ابدی جہنم کی سزا سنا چکا ہے۔ اس کے حبیب نے انسانی جان کو بیت اللہ کی حرمت سے زیادہ قرار دے دیا ہے۔ اس خدا کے نام پر یہ سب کرنا اس کے غضب کو بھڑکانے کے مترادف ہے۔

تو پھر انتظار کس کا ہے؟ مہلت کسے دی جا رہی ہے؟ جواب یہ ہے کہ مہلت انھیں نہیں دی جا رہی، عام آدمی کو دی جا رہی ہے، انتظار اس کے فیصلے کا ہے۔ عام آدمی علمی بحثیں نہیں سمجھتا۔ لیکن قتل ناحق کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ اگر اس پر بھی خاموش رہتا ہے، قاتلوں اور ان کے حمایتیوں کے خلاف نہیں اٹھتا تو پھر یہاں دو اینٹیں بھی سلامت نہیں رہیں گی۔ یہی خدا کے نام پر کھڑے لوگوں کے بارے میں ہزاروں برس سے دستور رہا ہے۔ بدنصیبی کی یہ کہانی پھر دہرا دی جائے گی۔

مرداورخواتین کالباس

کچھ عرصے سے ہندوستان میں خواتین کے ساتھ زیادتی کے واقعات بڑی تعداد میں پیش آرہے ہیں۔جبکہ خواتین کو ہراساں کرنے، جملے کسنے اور گھورنے وغیرہ کا معاملہ تو اتنا زیادہ ہے کہ وہ کسی اعداد وشمار کی گرفت میں نہیں آسکتا۔اس طرح کے واقعات کے پیچھے ہندوستانی مردوں کا یہ ذہن کام کرتا ہے کہ جو خواتین خود کو نہیں ڈھانک کر رکھتیں وہ مردوں کو اس طرح کی چیزوں پر خود ہی آمادہ کرتی ہیں۔چنانچہ اس سوچ کے ردعمل میں ہندوستان میں ایک مقبول تحریک یہ پیدا ہوگئی ہے کہ خواتین جیسا چاہے لباس پہنیں، یہ ان کا حق ہے۔چنانچہ مردوں کو اپنی یہ سوچ بدلنا چاہیے کہ وہ انھی خواتین کی عزت کریں گے یا تحفظ دیں گے جو خود کو ڈھانک کر رکھیں گی۔یہ وہی نقطہ نظر ہے جو مغرب میں رائج ہے اور جس کی بنا پر خواتین کسی بھی طرح کا لباس پہنیں، عام حالات میں مغرب میں کوئی ان کو گھور کر نہیں دیکھتا۔ایسا کرنا سماجی طور پر بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔

سوشل میڈیا کے زیراثر ہندوستان میں جاری اس تحریک کے اثرات اب ہمارے معاشرے پر بھی ہورہے ہیں۔مگر اس سے یک طرفہ طور پر یہ ذہن بنتا ہے کہ مردوں کو اپنی حدود میں رہنا چاہیے لیکن خواتین کے لیے کسی قسم کی کوئی حدود نہیں ہیں۔وہ جو چاہیں پہنیں اور جس طرح چاہے رہیں، یہ ان کا حق ہے۔ایسے میں ضروری ہے کہ اپنی نوجوان نسل کے سامنے اسلام کا نقطہ نظر پیش کیا جائے جو ایک انتہائی متوازن نقطہ نظر ہے۔

اسلام کی تعلیمات مذکورہ تحریک کے اس پہلو سے تو پوری طرح اتفاق کرتی ہے کہ خواتین کا لباس جیسا بھی ہو، مردوں کو اپنی نگاہوں کی حفاظت خود کرنا ہوگی۔یہ کہ خواتین کے لباس سے قطع نظر ان کو اپنے جذبات واحساسات پر خود کنٹرول کرنا ہوگا اور اپنے لباس کو پاکیزہ رکھنا ہوگا۔ان تعلیمات کو اصطلاحاً غض بصر اور حفظ فروج کہا جاتا ہے۔ہمارے برصغیر میں جہاں مردوں کا تصور

ہی یہی ہے کہ جو خواتین خود کو نہ ڈھانکیں، ان کو دیکھنا، چھیڑنا وغیرہ ہمارا حق ہے، اسلامی تعلیم کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ہم بھی اپنے معاشرے کے مردوں کی اصلاح کی غرض سے اس چیز پر خاص طور پر توجہ دلاتے رہتے ہیں۔

مگر ساتھ میں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے خواتین کو غض بصر اور حفظ فروج کے یہی احکام دے کر ان سے مزید یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ وہ اپنے نسوانی حسن اور ذوق آرائش دونوں کو اجنبی مردوں کے سامنے نمایاں نہ کریں۔یہاں اہل مغرب اور اہل ہند سے اسلام کا اختلاف شروع ہوتا ہے۔اسلام یہ نہیں کہتا کہ مرد تو اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور خواتین کو ہر طرح کا لباس پہننے کی مکمل آزادی ہے۔اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دونوں فریقوں کو اپنے اپنے حصے کی ذمہ داریاں پوری کرنا چاہئیں۔یہ صالح معاشرے کی بنیادی شرط ہے۔

خواتین کے لباس کے حوالے سے مسلمان اہل علم میں ابتدا ہی سے اختلاف چلے آرہے ہیں۔ایک نقطہ نظر وہ ہے جسے سعودی عرب میں دیکھا جاسکتا ہے۔دوسرا وہ ہے جو ملائشیا وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔لیکن سخت نقطہ نظر کو چھوڑ کر نسبتاً نرم نقطہ نظر کو بھی اختیار کر لیا جائے تب بھی وہ خواتین کو اپنی زینت اور نسوانیت دونوں کی نمائش سے روکتا ہے۔وہ بے حجابی، جسم کی نمائش اور عریانی کے ہر شائبے سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔چنانچہ اسلامی تعلیمات اپنی ہر تعبیر اور توجیہ میں بہر حال مغرب اور ہندی تہذیب کی روایات سے ایک مختلف جگہ پر کھڑی ہیں۔

یہ وقت کی ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات کے اس امتیاز اور توازن کو نمایاں کیا جائے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کا یہی وہ توازن ہے جو پاکیزہ معاشرت کا ضامن ہے اور اسی کی ہمیں اپنی نوجوان نسل کو تلقین کرنا چاہیے۔یہ نہیں کیا جائے گا تو آخر کار مرد سماجی دباؤ میں آکر اپنی نگاہیں نیچی کرلیں گے، مگر خواتین کی دنیا وآخرت ویسے ہی خطرے میں رہیں گی جیسے پہلے تھیں۔

شاباش اہلِ پاکستان شاباش

شاباش اہلِ پاکستان شاباش۔

یہ صرف پھلوں کی خریداری سے رکنے کی بات نہیں۔ یہ سماجی شعور کے ارتقا کا معاملہ ہے۔اس لیے اس معاملے کی کچھ تفصیل کرنا پڑے گی۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ دوسروں کے لیے اٹھایا گیا۔کبھی ترکوں کے لیے، کبھی عربوں کے لیے اور کبھی افغانوں کے لیے۔ان کے لیے ہم نے دنیا کی طاقتور اقوام کی دشمنیاں مول لے لیں۔اپنے گھر میں ہر طرح کا فساد گوارا کیا......اور ہاتھ کیا آیا؟

کیا اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت ہے؟

ہم نے ہمیشہ تحریکیں حکمرانوں کو ہٹانے کے لیے چلائیں۔کبھی کسی حکمران کو ''کتا'' قرار دے کر، کبھی کسی ''گنجے'' کے سر پر ہل چلا کر (نوجوان قارئین کو غلط فہمی میں پڑنے سے بچانے کے لیے تلمیحات کی بلاغت کو قربان کر کے ان کا مطلب بیان کرنا شاید ضروری ہے۔ جنرل ایوب کے خلاف چلائی گئی عوامی تحریک کا پاپولر نعرہ ''ایوب کتا ہائے ہائے'' تھا جبکہ بھٹو صاحب کے خلاف تحریک کا عوامی نعرہ ''گنجے کے سر پہ ہل چلے گا، گنجا سر کے بل چلے گا'' تھا۔) ......باقی تو ماضی قریب کی باتیں ہیں......کیا یاد دلانے کی کوئی ضرورت ہے؟

یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ اہلِ پاکستان کسی اور کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے اٹھے ہیں۔اپنے ایک اہم اور بنیادی مسئلے یعنی تاجروں کی پیدا کردہ سفاکانہ مہنگائی کے خلاف اٹھے ہیں۔کوئی تشدد نہیں، کوئی توڑ پھوڑ نہیں، کوئی احتجاجی جلسہ جلوس نہیں۔ وہ پرامن انداز میں ایک ظالم کو اس کے ظلم کا احساس دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سماجی ارتقا کی بہت بڑی نشانی ہے اور سوشل میڈیا اس شعور کو پیدا کرنے پر مبارک باد کا مستحق ہے۔

سماجی شعور کے ارتقا کی ایک دوسری علامت یہ ہے کہ اپنی تقدیر بدلنے کے لیے ہمیشہ سے ایک نجات دہندہ کی منتظر قوم کسی لیڈر کا انتظار کیے بغیر اپنے حالات کو بہتر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بہت سادہ مزاج ہیں وہ لوگ جو اسے محض پھل اور ریڑھی والوں کا مسئلہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے قومی مزاج میں بہت بڑی اور مثبت تبدیلی کی علامت ہے۔ یہ مزاج اگر آگے بڑھا تو مہنگائی تک ہی نہیں رکے گا۔ یہ کرپشن اور ظلم کی ہر قسم کے خلاف آواز اٹھاتا چلا جائے گا۔

اس لیے ہر باشعور پاکستانی کی ذمہ داری ہے کہ وہ آگے بڑھے اور ان لوگوں کا ساتھ دے جنھوں نے قوم کے شعور کو ایک پرامن مگر انتہائی موثر راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تین دن تک فروٹ نہ خریدنے کا معاملہ نہیں، یہ اپنے مسائل خود حل کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ انتظار کی نفسیات میں جینے سے نکل کر عمل کی دنیا میں قدم رکھنے کا معاملہ ہے۔

یہ تحریک اگر ناکام ہو بھی گئی تب بھی یہ ایک نئے سنگ میل کا آغاز ثابت ہوگی۔ یہ ایک نئے پاکستان کا نقطہ آغاز ہوگی جس میں عوام دوسروں کے لیے نہیں، اپنے لیے جدوجہد کرنا سیکھیں گے۔ جس میں لیڈروں کا انتظار کرنے کے بجائے لوگ اپنے اوپر بھروسہ کر کے اپنے مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کرنا سیکھیں گے۔

اس تحریک کا تصور ہی اہلِ پاکستان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔شاباش اہلِ پاکستان شاباش۔

پس نوشت

یہ تحریک الحمدللہ مثبت نتائج کے ساتھ کامیاب ہوئی۔اب اگلا قدم کیا ہو، اس کا جواب ایک تفصیلی مضمون کا تقاضہ کرتا ہے، مگر ایک جملے میں کرنے کا کام یہ ہے کہ الیکشن میں اصلاحات وہ بنیادی قدم ہے، جو قوم کو اس کا حقیقی حق حکمرانی دلوا سکتا ہے۔اب کوشش اس کے لیے ہونی چاہیے۔

بحث سے ایمان واخلاق تک

برسوں گزر گئے کہ علمی مباحث سے خود کو ہٹا کر ایمان واخلاق تک محدود کر دیا ہے۔ پھلوں کے بائیکاٹ کی مہم کا بھلا ہوا کہ اس نے اس فیصلے کی صحت پر دل کو مزید مستحکم کر دیا۔

پاکستان عرب کی وادی ”غیر ذی زرع“ نہیں، پانچ دریاؤں اور چار موسموں کی سرزمین ہے جسے قدرت نے زراعت اور باغبانی کے لیے بہترین جغرافیے سے نوازا ہے۔ میدان ہی نہیں، پہاڑ اور صحراؤں کے پھل بھی یہاں بکثرت اگائے جاتے ہیں۔ جو کمی رہ جاتی ہے وہ پڑوسی ملکوں سے پوری ہو جاتی ہے۔ ایسے ملک میں جب تیس روپے کلو ملنے والا پھل رمضان میں اچانک نوے روپے کلو ہو جائے تو اس چمتکار کا اہم سبب وہ کارٹل ہوتا ہے جو سونے کے دو پہاڑ ملنے کے بعد تیسرے کی جستجو شروع کر دیتا ہے اور جس کا پیٹ صرف قبر کی مٹی بھرے گی۔

اس مافیا کے خلاف جب قوم نے خود کو منظّم کیا تو قوم کے اس اتحاد کے خلاف ان بعض اذہان کو دیکھ کر دل پھٹ گیا جن کے ذہن وقلم پر دانش کا کچھ گمان ہوتا تھا۔ ان دوستوں کا سرمایہ استدلال کیا تھا؟ وہی جو کل تک دہشت گردی کے حامی اس ملک میں دہشت گردوں پر سے توجہ ہٹانے کے لیے پیش کیا کرتے تھے۔ یعنی جب کبھی دہشت گردی زیر بحث آتی، فوراً کچھ پریشان حال مسلمانوں کی تصویریں سامنے کر دی جاتیں۔

جب دہشت گردی کا عفریت زیر بحث ہو تو کچھ مظلوموں کی تصویریں لگا کر بات کا رخ موڑ دینا اور جب مہنگائی کے جن کو قابو میں لانے کی کوشش کی جائے تو پھل فروشوں کی مظلومیت کا احوال سنا کر قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرنا، معذرت کے ساتھ، معقولیت نہیں پروپیگنڈا ہے۔

ہم نے برسوں پہلے یہ سیکھ لیا تھا کہ پروپیگنڈے کی اس دنیا میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ایمان، اخلاق، اقدار اور معقولیت کی صدا بلند کی جائے۔ اللہ نے چاہا تو ایک نئی قوم یہیں سے پیدا ہوگی جو ذاتی رجحانات اور تعصّبات سے بلند ہو کر معقولیت کی بنیاد پر جینا سیکھ لے گی۔

سلسلہ روز وشب

ابو یحییٰ

ایک قابل تقلید مثال

پچھلے دنوں مجھے بعض وجوہات کی بنا پر اپنے ایک محترم دوست ڈاکٹر مظہر اعوان صاحب کے آنکھوں کے ہسپتال میں ایک دن گزارنا پڑا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا کہ جسے قارئین کے ساتھ شیئر نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے اس روز کے تجربات اور مشاہدات کو آج کے سلسلہ روز وشب کا موضوع بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب آئی اسپیشلسٹ ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی غریبوں اور مڈل کلاس کے لوگوں کو آنکھوں کے علاج کی وہ طبی سہولیات فراہم کرنے کے لیے وقف کر رکھی ہے جس کا بوجھ اٹھانا صرف طبقہ امرا ہی کے لیے ممکن ہے۔ ڈاکٹر مظہر صاحب سے میرا ذاتی تعلق ایک دہائی سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ تاہم بالواسطہ طور پر میں ان سے پہلے ہی سے واقف تھا۔ انھوں نے میری والدہ کا موتیا کا آپریشن کیا تھا۔ وہ اس وقت ایک نجی ہسپتال میں بطور سرجن کام کر رہے تھے، مگر اس کے باوجود ان کی طرف سے اس خوش اخلاقی اور نرم گفتاری کا معاملہ سامنے آیا تھا جو آج کل ڈاکٹروں میں عملی طور پر ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بعد میں ملازمت کو خیر باد کہا اور کل وقتی طور پر اپنی زندگی غریبوں کو مفت اور مڈل کلاس کو بہت مناسب قیمت پر آنکھوں کے اعلیٰ ترین علاج کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے وقف کر دی۔ ہمارے بعض اہل خیر دوستوں کے تعاون سے انھوں نے میرے دفتر کے برابر ہی میں اپنا آئی کلینک شروع کیا۔ ان کی نظر عنایت نے ان کی ویلفیئر ایسوسی ایشن کے لیے بطور صدر اس خاکسار کا انتخاب کیا۔

چنانچہ تب ہی سے روزانہ کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب سے واسطہ پڑنے لگا جس کے بعد اندازہ ہوا کہ ملنساری اور نرم گفتاری ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا حصہ ہے جس کا اظہار اپنے پرائے سب لوگوں کے ساتھ یکساں طور پر ہوتا ہے۔ان کے اخلاص کو دیکھتے ہوئے اہل خیر ان کے ساتھ شامل ہوتے رہے اور اب ماشاءاللہ ان کے زیر نگرانی آنکھوں کا ایک بڑا ہسپتال چل رہا ہے جس میں متعدد قسم کے پیچیدہ ٹیسٹوں اور جدید آپریشن کا بھی انتظام ہے۔

پاکستان اور علاج معالجے کی سہولیات

پاکستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ اپنے آغاز ہی سے یہ ایک فلاحی ریاست کے بجائے سیکیورٹی ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔اس کی سب سے بھاری قیمت پاکستان کے عوام کو دینا پڑی ہے۔غیر معمولی وسائل کی حامل اس ریاست کے باشندوں کے لیے بنیادی طبی علاج اور بنیادی تعلیم بھی ایک خواب بن چکی ہے۔تعلیم اور علاج کے نام پر جو کچھ حکومت کی طرف سے دستیاب ہے وہ انتہائی محدود اور غیر معیاری ہے۔اس برس یعنی سن 18-2017 کے 53 کھرب روپے کے بجٹ میں صحت کے شعبے میں صرف 49 ارب روپے رکھے گئے ہیں۔اسی روش کا نتیجہ ہے کہ کراچی جیسے ڈھائی کروڑ سے زیادہ کی آبادی پر مشتمل شہر کے لیے حکومتی سطح پر علاج فراہم کرنے کے ہسپتال انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

اس وجہ سے ایک طرف تو سرکاری ہسپتالوں میں بے پناہ رش ہوتا ہے اور دوسری طرف وہاں تعینات عملہ غریبوں کے ساتھ جس طرح پیش آتا ہے وہ ان کی عزت نفس پر ایک تازیانے کا کام کرتا ہے۔ظلم یہ ہے کہ طبی عملے کا یہ غیر انسانی اور غیر ہمدردانہ رویہ بہت سے پرائیوٹ ہسپتالوں میں بھی عام ہے۔یہ ہمارے عمومی اخلاقی بحران کا ایک شاخسانہ ہے۔

ایسے میں جب کچھ فلاحی ادارے غریبوں کے لیے قائم کیے جاتے ہیں تو وہاں بھی کبھی

مریضوں کی کثرت کی بنا پر اور کبھی عمومی اخلاقی بحران کی بنا پر مریضوں کو غیر ہمدردانہ رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔وگرنہ خیراتی ہسپتال میں علاج کرانے کا لیبل تو بہرحال لگتا ہی ہے۔لیکن غریب مجبور ہے کہ اسے بہرحال زندہ رہنا ہے اور اس کے لیے اپنا علاج کرانا اس کی ضرورت ہے۔

ایک منفرد تصور

ان فلاحی اور سرکاری ہسپتالوں سے برا بھلا غریبوں کا بہرحال معاملہ چل رہا ہے جبکہ پیسے والے لوگ اپنا معیاری علاج بڑے اور مہنگے پرائیوٹ ہسپتالوں میں کرا لیتے ہیں۔ایسے میں جو طبقہ سب سے زیادہ مشکل میں آتا ہے وہ مڈل کلاس کا ہے۔وہ بے چارے فلاحی یا سرکاری اداروں میں جائیں تو ذلت آمیز رویے کے ہاتھوں پریشان ہوتے ہیں۔جبکہ مہنگے پرائیوٹ ہسپتالوں میں جانا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔

یہ وہ صورتحال تھی جس میں ڈاکٹر مظہر صاحب نے غریبوں کے ساتھ مڈل کلاس کی مدد کے لیے کم از کم اپنے شعبے یعنی آنکھوں کے علاج میں ایک بالکل منفرد تصور متعارف کرایا ہے۔انھوں نے جو ہسپتال قائم کیا ہے وہ ہر اعتبار سے ایک معیاری ہسپتال ہے جہاں کروڑوں روپے کی مالیت کی مہنگی مشینیں نصب ہیں جو صاحب خیر افراد کے تعاون سے خریدی گئی ہیں۔تاہم یہاں آنے والوں کا علاج مفت نہیں کیا جاتا بلکہ ایک مناسب فیس لی جاتی ہے۔مثال کے طور پر شہر کے دوسروں نجی ہسپتالوں میں آنکھ کا جو آپریشن پینتیس چالیس ہزار کا ہوتا ہے یہاں صرف بارہ ہزار کا ہو جاتا ہے۔

اس فیس کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ایک یہ ہے کہ ہسپتال کا معیار برقرار رکھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔اس معیار کے نتیجے میں شہر کے پوش علاقوں کے لوگ بھی اسی اطمینان سے علاج کرانے یہاں آتے ہیں جس اطمینان کے ساتھ مڈل کلاس یا غریب لوگ علاج کرانے آتے ہیں۔دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ہسپتال پر عوام کا وہ رش نہیں ٹوٹتا جس کے نتیجے میں معیار اور اخلاق دونوں کا قائم

رکھنا عملاً ناممکن ہوجاتا ہے۔

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں غریب غربا کا علاج نہیں ہوتا۔ ہر روز یہاں ان لوگوں کا علاج اور آپریشن کیا جاتا ہے جو اپنا علاج کرانے کے لیے یہ رعایتی فیس دینے کے قابل بھی نہیں ہوتے۔ جو لوگ کچھ فیس دینا برداشت کر سکتے ہیں، ان کا علاج ایسے ہی کیا جاتا ہے جیسے مکمل فیس دینے والوں کا کیا جاتا ہے۔ ویلفیئر کے شعبے کے علاوہ ڈاکٹروں یا عملے کو بھی علم نہیں ہوتا کہ کون شخص پیسے دے کر آرہا ہے اور کون زکوٰۃ کی رقم سے علاج کروا رہا ہے۔

ایسے لوگوں کے علاج کی رقم ہسپتال نہیں دیتا بلکہ صاحب خیر افراد اپنے زکوٰۃ اور عطیات سے ادا کرتے ہیں۔ مریضوں کے احوال کی تحقیق کے بعد زکوٰۃ کی مد سے ان کا علاج اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح فیس دینے والوں کا۔ اس طرح یہ شاید واحد ہسپتال ہے جس میں پیسے والے لوگ، مڈل کلاس اور غریب لوگ یکساں طور پر اپنا علاج کراتے ہیں۔ پیسے والے معیار کی وجہ سے، مڈل کلاس معیار کے ساتھ مقابلتاً سستا ہونے کی بنا پر اور غریب لوگ مفت علاج کی سہولت کی بنا پر یہاں علاج کراتے ہیں۔

آپریشن تھیٹر میں

ڈاکٹر مظہر صاحب صبح کے وقت آپریشن کرتے ہیں۔ جبکہ دوپہر میں مریضوں کا معائنہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ساتھ مجھے بھی دعوت دی کہ میں آپریشن تھیٹر میں چل کر یہ دیکھوں کہ آنکھ کے آپریشن کیسے کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ پہلے میں ان کے ساتھ آپریشن تھیٹر والے حصے میں گیا۔ یہاں جراثیم کا داخلہ روکنے کے لیے ہر ممکن اہتمام کیا گیا تھا۔ تمام جگہیں سیل پیک تھیں۔ تمام عملہ چپلیں باہر اتار کر صاف چپلیں پہن کر اندر داخل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا لباس تبدیل کر کے سرجری کرنے کا خاص لباس پہنا اور پھر خصوصی کیمیکل سے اپنے ہاتھ کہنیوں تک اچھی

طرح دھوئے۔ اس سب کا مقصد مریض کو کسی بھی انفیکشن سے بچانا تھا۔

ابتدائی حصے میں مریضوں کے ساتھ آنے والے افراد بٹھائے جاتے تھے۔ یہ کمرہ عین آپریشن تھیٹر کے برابر میں تھا اور بیچ میں ایک شیشہ لگا ہوا تھا جس میں سے لوگ یہ دیکھ سکتے تھے کہ ڈاکٹر کس طرح ان کے مریض کا آپریشن کر رہے ہیں۔ اس چیز سے مریض کا حوصلہ بھی بلند رہتا تھا اور مریض کے گھر والے بھی مطمئن رہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں بھی طبی عملے کا خصوصی لباس پہن کر اور منہ پر ماسک لگا کر آپریشن تھیٹر میں داخل ہو گیا۔ مجھے یہ اطلاع کر دی گئی تھی کہ مجھے یہاں کسی چیز کو چھونا نہیں ہے۔ اندر طبی عملہ پہلے ہی سے موجود تھا جس نے مریض کی تمام تر ذہنی اور جسمانی تیاریاں مکمل کر لی تھیں جیسے اس کی آنکھ کو سن کر کے آپریشن کے لیے تیار کر دیا گیا تھا۔ سامنے کمپیوٹر ڈسپلے پر مریض کے نام سے لے کر، مرض کی تشخیص اور اس کی مادری زبان تک ہر چیز کی معلومات درج تھیں تاکہ آپریشن میں کسی بھی غلطی یا غلط فہمی کے امکان کو رد کیا جا سکے۔ اس کے نیچے مریض کے دل کی دھڑکن، ای سی جی، خون میں آکسیجن کی مقدار وغیرہ ہر چیز لمحہ بہ لمحہ اپ ڈیٹ ہو رہی تھی۔

اس آپریشن میں چونکہ مریض ہوش میں ہوتا ہے اس لیے اس سے گفتگو کے لیے ڈاکٹر صاحب اور عملے کو پاکستان کی تمام زبانوں سے واقفیت تھی تاکہ مریض کو پرسکون رکھا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ یہاں آپریشن کے لیے عالمی معیار کی انتہائی جدید مشینیں اور ٹیکنالوجی موجود ہے۔ اس جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے آپریشن کو نہ صرف بہت جلد اور مہارت کے ساتھ کر دیا جاتا ہے بلکہ مریض ایک دن بعد ہی اپنے معمولات سرانجام دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔

خدائی نعمت

ڈاکٹر صاحب نے میرے سامنے کئی مریضوں کے موتیا کے آپریش کیے۔ وہ مجھے دکھاتے

بھی رہے کہ کس طرح وہ آنکھ کے لینز پر بہت ہی باریک کٹ لگا کر پہلے موتیا کو باہر نکالتے تھے اور پھر ایک مصنوعی لینز کو اسی زخم سے آنکھ میں لگا دیتے تھے۔

میں یہ دیکھ رہا تھا اور اللہ کی اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ کس طرح جدید ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانیت پر یہ عظیم احسان کیا ہے کہ آج کے انسان اندھے پن سے بچ کر اپنی زندگی نارمل لوگوں کی طرح گزار سکتے ہیں۔ ہر چشمہ پہننے والا اپنا چشمہ اتار کر یہ تجربہ کر سکتا ہے کہ اللہ نے کس طرح اس کے جزوی اندھے پن کو دور کر رکھا ہے۔ جبکہ موتیا وغیرہ کے مریض بھی اس وقت سے گزرتے ہیں جب ان کی آنکھیں ان کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہیں اور پھر ایک نازک آپریشن کے بعد وہ نابینا سے بینا ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ ہمارے اندر احساس ہو تو ہمیں سب سے بڑھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں ایسے دور میں پیدا کیا جس میں علاج کی ایسی غیر معمولی سہولیات موجود ہیں اور اس ہسپتال کی شکل میں بعض اہل خیر کے تعاون سے اب غریبوں کی پہنچ میں بھی ہیں۔ یہ سہولیات نہ ہوتیں تو نجانے کتنے لوگ اندھے پن کے ساتھ زندگی گزارتے۔ مگر میں یہ سوچتا ہوں کہ اندھا پن نظر ہی کا نہیں ہوتا، دل کا بھی ہوتا ہے۔

دل کا اندھا پن اور ہمارا اخلاقی زوال

دل کے اندھے پن کے بعد انسان شکر گزار نہیں رہتا۔ وہ شکوے اور شکایت کی نفسیات میں جیتا ہے۔ آج کے مسلمان تو ایک اور طرح کے اندھے پن کا شکار ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ان کے پاس قرآن مجید کا وہ نور موجود ہے جو اس دنیا میں کامیابی کے ساتھ اگلی دنیا میں بھی کامیابی کا راستہ بتاتا ہے۔ یہ راستہ ایمان و اخلاق کی دعوت ہے۔ مگر مسلمان نہ اس راستے پر چلتے ہیں نہ دوسروں کو بلاتے ہیں۔ اس اندھے پن کا کوئی کیا کرے۔

یہاں بیٹھ کر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ان جدید مشینوں، آلات اور ایجادات میں مسلمانوں کا

حصہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہمارے ہاں یہ سوچ ہی نہیں ہے کہ تعلیم وہ راستہ ہے جس پر چل کر قومیں نہ صرف معاشی ترقی کرتی ہیں بلکہ سائنس اور ایجادات میں بھی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں جو حشر صحت کا ہے وہی تعلیم کا بھی ہے۔ نہ اُس پر توجہ نہ اِس پر توجہ۔ تعلیم کا بجٹ چند برسوں سے کچھ نہ کچھ بڑھا ہے، مگر اس شعبے میں اتنی کرپشن بڑھ چکی ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام مکمل طور پر گل سڑ گیا ہے۔ رشوت دے کر استاد بننا ایک سرکاری ملازمت کے حصول کا شاید سب سے آسان نسخہ ہے۔ اس لیے قابل اساتذہ کے بجائے نااہل لوگ ہر طرف چھا گئے۔ انھی لوگوں کے ہاتھ میں تعلیم کا جو کچھ بجٹ آتا ہے وہ کرپشن کی نذر ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر صاحب نے دوران گفتگو مجھے ایک واقعے کی شکل میں اساتذہ کے اخلاقی انحطاط کا معاملہ ایک ذاتی مثال سے بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے بیٹے کو اسلامیات کے استاد سے کوئی سوال کرنا تھا۔ استاد نے بچے کو سوال کا جواب دینے کے بجائے جھاڑ دیا۔ بچے نے یہ واقعہ والد کو سنایا اور کہا کہ دیکھیے اب میں یہ سوال اپنی کلاس فیلو لڑکی کے ذریعے سے کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں بذریعہ ایک نسوانی وجود سوال کا جواب آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر بہت دکھ تھا کہ یہ واقعہ اسلامیات کے استاد کے حوالے سے پیش آیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس حوالے سے ہمارا زوال ہمہ گیر ہے، اسلامیات یا کسی دوسرے سبجیکٹ کی کوئی قید نہیں ہے۔ ہاں لوگ اہل دین سے بہتر رویہ کی توقع رکھتے ہیں۔ مگر اہل دین نے جب ایمان و اخلاق کی دعوت کو موضوع نہیں بنایا تو نہ دوسرے بہتر ہو سکتے ہیں نہ وہ بہتر ہو سکتے ہیں۔ ہمارے مسائل کا حل یہی ہے کہ ایمان و اخلاق پر مبنی ایک زبردست دعوتی تحریک اٹھے جو لوگوں کو بنیادی اخلاقیات میں اسی طرح حساس بنائے جس طرح قرآن مجید چاہتا ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا راستہ تباہی کی طرف جاتا ہے۔

ٹیم ورک

میں نے آپریشن تھیٹر میں یہ بھی دیکھا کہ کس طرح آپریشن ٹیم ورک کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ساری توجہ آپریشن پر تھی جس کے لیے بڑی مہارت کی ضرورت تھی۔ مگر باقی ہر چیز کی ذمہ داری ان کے طبی عملے نے اٹھا رکھی تھی۔ مریض کی آنکھ کو سن کرنا، ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پھیلانے پر ہر ضرورت کی چیز ان کے ہاتھ میں تھما دینا، لینز لگنے کا موقع آنے سے قبل ہی کہے بغیر لینز کو تیار کر کے رکھنا یہ وہ چیزیں تھیں جو اگر ٹھیک طرح نہ کی جائیں تو سرجن کا دھیان بٹانے کا سبب بنیں گی اور آپریشن ناکام ہو سکتا ہے۔

یہی چیز ہر اجتماعی معاملے میں ہوتی ہے۔ ہر جگہ صف اول کے لوگوں کے پیچھے صف دوم کے لوگ خاموشی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنا کام نہ کریں تو کوئی اجتماعی کام کامیاب نہیں ہوسکتا۔ قومیں جس طرح اعلیٰ ترین لوگوں کی محتاج ہوتی ہیں اس طرح صف دوم کے لوگوں کی بھی محتاج ہوتی ہیں۔

تجارتی معاملات میں صف اول اور صف دوم دونوں طرح کے لوگ معاوضے کے عوض دستیاب ہو جاتے ہیں، مگر غیر تجارتی معاملات میں صورتحال مختلف ہوتی ہے۔ یہاں صف اول کے لوگ خدا کے قانون کے مطابق اکا دکا پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن صف دوم کے لوگوں کو صورتحال کو سمجھ کر ان کا ساتھ دینے کے لیے خود آگے آنا پڑتا ہے۔ وہ اگر آگے نہیں آتے تو بڑی سے بڑی صلاحیت کا شخص ناکام ہو جاتا ہے۔

زندہ خلیے اور شعور سازی پر انفاق کی ضرورت

میں تین چار آپریشن دیکھنے کے بعد دوبارہ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں انتظار کے لیے آ گیا۔ وہاں نثار صاحب جو ادارے کے مینیجر ہیں ان سے کچھ گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اپنے بیرون ملک قیام کے کچھ واقعات سنائے۔ ان میں سے ایک واقعہ نوے کی دہائی کا تھا جب سوویت یونین

ٹوٹنے کے بعد وسط ایشیائی مسلم ریاستیں آزاد ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں بہت سے پاکستانی تعلیم اور تجارت کے لیے وہاں جانا شروع ہوئے۔ اس زمانے میں بہت سے پاکستانی جو وہاں گئے انھوں نے وہاں کی خواتین سے جو سرخ و سفید رنگ اور اچھے قد و قامت کی بنا پر پرکشش ہوتی تھیں، کافی تعداد میں شادیاں کیں مگر پھر ان کو چھوڑ کر پاکستان لوٹ آئے۔ نثار صاحب نے اپنے سامنے کا ایک ایسا ہی ایک واقعہ بتایا جب ایک پاکستانی ایک مقامی لڑکی کو واپس آ کر لے جانے کا وعدہ کر کے روتا ہوا چھوڑ آیا۔ جہاز میں نثار صاحب نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ تو پہلے ہی بال بچوں والا ہے اور اس نے یہ شادی ٹائم پاس کرنے کے لیے کی تھی۔

بعد میں ڈاکٹر مظہر صاحب آپریشن سے فارغ ہو کر تشریف لے آئے تو ہمارے اخلاقی زوال پر بات ہونے لگی۔ میں نے اس موقع پر یہ توجہ دلائی کہ جس طرح میں نے اپنی کتاب عروج و زوال کا قانون میں لکھا ہے کہ اس اخلاقی زوال کے باوجود ہمارے ہاں بڑی تعداد میں اعلیٰ لوگوں کے پیدا ہوتے رہنے کا سبب یہ ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کے ابتدائی دور میں ہیں۔ گویا کہ ہماری کیفیت ایک نوجوان کی ہے جسے امراض نے گھیر لیا ہے۔ مگر مسلسل زندہ خلیے پیدا ہو کر بیماری کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ تاہم اگر بیماری زیادہ بڑھی تو پھر یہ زندہ خلیے بھی ایک ایک کر کے مر جائیں گے۔ اس صورتحال کو روکنے کا طریقہ یہی ہے کہ ایمان و اخلاق کی دعوت بڑے پیمانے پر برپا کی جائے تاکہ بڑی تعداد میں زندہ لوگ پیدا ہو کر اس اخلاقی زوال کا خاتمہ کر سکیں۔

دوران گفتگو یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ ہمارے ہاں لوگ بڑی تعداد میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ مگر اس کا بہت بڑا حصہ مساجد کی تعمیر اور ان میں اعلیٰ ترین سہولیات کی فراہمی پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اب اے سی، جنریٹر، قالین، گنبد وغیرہ پر بہت پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت سب سے زیادہ خرچ کی ضرورت شعور سازی اور انسان سازی کے کام پر کرنے کی ہے۔ اس

وقت ہمارے ہاں پیدا ہونے والے ڈاکٹر مظہر صاحب جیسے اعلیٰ لوگ کسی تربیتی ادارے کا نتیجہ نہیں بلکہ خدائی قانون کے تحت پیدا ہو رہے ہیں۔لیکن اگر شعور سازی اور تربیت کا عمل شروع کیا جائے اور ایمان واخلاق کی دعوت کے فروغ کا کام کیا جائے تو بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زندگی کے ہر شعبے میں خیر اور معاشرے کی ترقی کا باعث ہوں گے۔

ایک شاندار ادارہ

دو پہر کا کھانا بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کھایا۔ یہ بھی ایک دلچسپ مرحلہ تھا۔ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں کیفے ٹیریا گیا۔ یہاں اصول ہے کہ تمام اسٹاف کا کھانا ہسپتال کی طرف سے مفت فراہم کیا جاتا ہے اور صفائی کا بھی غیر معمولی اہتمام ہے۔سب لوگ کھانا کھا کر اپنے برتن وغیرہ خود دھوتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب اپنے اسٹاف کا بے حد خیال کرتے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے برسہا برس پہلے ان کو جوائن کیا تھا وہ آج کے دن تک ان کے ادارے میں موجود ہیں۔

میں شام تک اس ادارے میں رہا۔دل سے ڈاکٹر صاحب اور ان لوگوں کے لیے دعائیں نکلیں جنھوں نے اپنی زندگی اور مال کو ان کاموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر مظہر صاحب نے ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔ ہمارے ملک کو ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیات اور ان کے ہسپتال جیسے اداروں کی بہت ضرورت ہے۔اللہ نے چاہا تو خیر کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا۔

جہاں رہیں اللہ کے بندوں کے لیے باعث رحمت بن کر رہیں۔اللہ نگہبان۔

سوال وجواب

ابو یحییٰ

منکر خدا کا انجام

سوال:

السلام علیکم ابو یحییٰ صاحب امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہونگے میں آپ کا پرانا قاری ہوں میں نے آپ کی جب زندگی شروع ہوگی،قسم اس وقت کی،قرآن کا مطلوب انسان نامی کتابیں پڑھیں ہیں اور سفر نامہ زیر مطالعہ ہے میں نے یہ کتابیں تب پڑھی تھیں جب میں ایک عام مسلمان تھا لیکن الحاد کی سٹڈی نے مجھے دین بے زار کر دیا اور اب میرا خدا پر ایمان تقریبا نہ ہونے کے برابر تھا زیادہ سے زیادہ میں خدا کو تو مان سکتا ہوں لیکن اسلام پر یا کسی بھی مذہب پر میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا مجھے نہیں لگتا کہ موجودہ کوئی بھی مذہب خدا کی طرف سے ہے مذہبی عبادات میں کوئی دلچسپی یا کشش محسوس نہیں ہوتی میں ہمیشہ اچھائی کی کوشش کرتا ہوں میری وجہ سے کسی کو تکلیف نہ ہو یہ کوشش رہتی ہے مذہب یا خدا کو لے کر کوئی بدگمانی بھی نہیں رکھتا میرا آپ سے چھوٹا سا سوال ہے جو ظاہر ہے میری گفتگو سے آپ پر عیاں ہو گیا ہوگا لیکن پھر بھی عرض کر دیتا ہوں سوال یہ ہے کہ ایک شخص جو کہ خدا کے وجود پر عدم ثبوت کی بنا پر ملحد ہو جاتا ہے یا کم سے کم مذہبی خداؤں پر یقین نہ کر پاتا ہو اس کے اندر کوئی برائی نہ ہو ہمیشہ سچائی کی تلاش میں اپنی سی کوشش کرتا رہتا ہو ایسا شخص اگر اسی کشمکش میں فوت ہو جائے اسلام کے مطابق اس کا کیا حشر ہوگا۔

والسلام

عبدالمجید

جواب:

محترمی ومکرمی عبدالمجید صاحب

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کو اپنے الحاد پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہم نے پہلی دفعہ الحادی لٹریچر کو پڑھا تھا تب ہم بھی ملحد ہو گئے تھے۔ مگر مطالعہ کا عمل جاری رہا تو الحمدللہ یہ بات عیاں ہو گئی الحادی لٹریچر بھی اتنا ہی سطحی ہے جتنا کسی اور قسم کا مذہبی لٹریچر۔ ہر وہ شخص جو مذہبی لٹریچر کو پڑھنے کے بعد الحادی لٹریچر کو پڑھتا ہے اسی تجربے سے گزرتا ہے۔ الحمدللہ مگر اس کے بعد انسان کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے تو انسان جان لیتا ہے کہ وہی بات حق ہے جو قرآن مجید نے بیان فرمائی ہے کہ " افی اللہ شك فاطر السمٰوات والارض" یعنی کیا تم اس کی ہستی کے بارے میں شک کرتے ہو جس نے آسمان وزمین کو عدم سے وجود بخشا ہے۔

اگر آپ تعصب میں مبتلا نہیں ہوئے اور پڑھتے رہے تو آخر کار قرآن کریم کے اس بیان کی سچائی کو ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔

جہاں تک آپ کے متعین سوال کا تعلق ہے کہ برائی سے بچنے والے ایک ملحد کے ساتھ روز حشر کیا ہوگا تو یہ ایک قضیہ ہے جس کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص کا مقدمہ سننے اور اس سے جرح کے بعد کریں گے۔ جرح سے مراد اس طرح کے سوالات ہیں کہ مثلاً جس الحادی فکر کی بنیاد پر تم میرا انکار کر رہے تھے وہ ہر قدم پر بالواسطہ استدلال کر کے ان دیکھے حقائق کو ماننے اور بیان کیے چلی جا رہی تھی۔ اس کے بعد تمھیں نہ ماننے کے لیے میں ہی ملا تھا جسے بن دیکھے ماننے کے حق میں اس سے کہیں زیادہ بالواسطہ دلائل موجود تھے جتنے دلائل عالم کبیر (Macro World) اور عالم صغیر (Micro World) کے حقائق کو ماننے کے لیے موجود تھے۔

اگر خدا کو نہ ماننے والا شخص کسی طرح اللہ تعالیٰ کی جرح کا سامنا کرنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ ثابت کر دیا کہ واقعی اسے وجود خداوندی کا کوئی ثبوت حقیقی کوشش کے بعد بھی نہیں ملا تھا تو پھر اسے معاف کر دیا جائے گا اور اس جرم کی پاداش میں جہنم میں نہیں پھینکا جائے گا۔ باقی رہی جنت تو جو آدمی خدا کو نہیں مانتا وہ جنت کو بھی نہیں مان سکتا۔ نہ وہ اس کا طلبگار ہوگا نہ اس نے اس میں داخلے کی نیت سے کوئی اچھائی کی ہوگی۔ اس لیے میری ناقص رائے یہ ہے کہ ایسے شخص پر سب سے بڑا احسان یہی کیا جائے گا کہ حشر کے دن اسے فنا کر دیا جائے۔ یہ احسان اس پہلو سے ہوگا کہ جنت کو دیکھنے کے بعد اس میں نہ جانا خود محرومی اور پچھتاوے کا ایک عذاب بن جائے گا۔ اور عدل یہ اس پہلو سے ہوگا کہ جس نے خدا کو عدم سمجھا اس کا انجام یہی ہو سکتا ہے کہ اسے خود عدم سے دوچار کر دیا جائے۔ تاہم یہ میری رائے ہے۔ اُس روز اصل فیصلہ رب کریم کی ذات ہی کرے گی جو علیم وحکیم ہے، والسلام

ابو یحییٰ

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (40)

دعوت کے رد وقبول کے نتائج

قرآن مجید کے مضامین کے بیان میں جو ترتیب ہم نے قائم کی تھی اس میں سب سے پہلے دعوت دین کے دلائل پر بات کی گئی تھی۔ اس میں ہم نے یہ بتایا تھا کہ قرآن مجید میں میں وجود باری تعالیٰ، آخرت، توحید اور نبوت کے کیا دلائل دیے گئے ہیں۔ مضامین قرآن میں ان دلائل کے بعد ہم نے دوسرا عنوان ''دعوت اور اس کے رد وقبول کے نتائج'' کا قائم کیا تھا۔ یہ قرآن کا بنیادی موضوع ہے اور یہی سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ اسی کو عرف عام میں عقائد یا ایمانیات کہتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اصل ترتیب میں اسے سب سے پہلے رکھا تھا، تاہم عام طور پر لوگ قرآن مجید کے دلائل سے بالعموم واقف نہیں اور نہ اس پر بہت زیادہ کام ہوا ہے، اسی لیے ہم نے دلائل کو پہلے بیان کر دیا تھا۔ جس کے بعد ہم نے دعوت اور اس کے رد وقبول کے نتائج پر گفتگو شروع کی۔ اس میں پہلے ہم نے دین کی بنیادی دعوت کے عنوان سے دعوت عبادت رب، شرک کی تردید اور اللہ کی ذات، صفات اور سنن جیسے اہم موضوعات پر قرآن مجید کا نقطہ نظر سامنے لائے تھے۔ اس کے بعد دعوت کے ابلاغ کے عنوان کے تحت ہم فطرت، نبوت ورسالت، ملائکہ اور صحف سماوی کے موضوعات کو زیر بحث لائے تھے۔

منصوبہ الٰہی اور انذار وتبشیر

اس ضمن کا تیسرا اور آخری موضوع ''دعوت کے رد وقبول کے نتائج'' کا ہے۔ انبیا علیھم السلام ایک طرف لوگوں کو خدا پر ایمان، تنہا اس کی عبادت کرنے اور شرک سے بچنے کی دعوت دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگوں کو اس دنیا میں خدا کے منصوبے سے آگاہ کرتے ہیں کہ اس

نے یہ دنیا عارضی طور پر اور امتحان کے لیے بنائی ہے۔ یہاں یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون ہے جو بن دیکھے خدائے رحمان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا اور اپنی محبت، عبادت، اطاعت اور وفاداری کو اس کے لیے خاص کر دیتا ہے اور کون ہے جو اس عارضی دنیا پر ریجھتے ہوئے خدا کا انکار، اس کے ساتھ شرک، تکبر اور غفلت کی وجہ سے دعوت حق کا انکار اور بندگان خدا پر ظلم کر رہا ہے۔ انبیا علیھم السلام بتاتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب قیامت کا زلزلہ اس عارضی دنیا کو تہہ و بالا کر دے گا۔ پھر ایک نئی دنیا شروع ہوگی۔ اس دنیا میں صرف دو انجام انسانوں کے منتظر ہیں۔ ایک جنت کی شکل میں ابدی طور پر خدا کی نعمت وعطا کا مقام اور دوسرا جہنم کی شکل میں اس کی پکڑ اور سزا کا انجام۔ جو لوگ دعوت حق کو مان کا ایمان واخلاق کے تقاضے نبھائیں گے ان کا بدلہ ابدی جنت ہے۔ جبکہ منکرین، متکبرین اور ظالموں کا انجام جہنم ہے۔

انبیا کے اس کام کو قرآن مجید کی اصطلاح میں انذار وتبشیر کہا جا سکتا ہے۔ انذار کا لفظی مطلب خبردار کرنا ہے۔ تاہم قرآن مجید میں اس کا مطلب خدا کی پکڑ اور جہنم کے عذاب سے خبردار کرنا ہے۔ جبکہ تبشیر کا مطلب بشارت دینا یا خوش خبری دینا ہے۔ یہ خوشخبری خدا کے اس انعام کی ہوتی ہے جو خدا ابدی جنت کی شکل میں اپنے وفاداروں کو دے گا۔

ہم نے اوپر رسول اور نبی کی بحث میں یہ واضح کیا تھا کہ رسولوں کے مخاطبین میں سے جو کفر کرتے ہیں، ان پر دنیا ہی میں عذاب آ جاتا ہے۔ اس عذاب سے صرف ان کے ماننے والوں کو بچایا جاتا ہے اور ان کو زمین کا وارث بنا دیا جاتا ہے۔ یہ گویا اسی دنیا میں اس سزا و جزا کا ایک عملی نمونہ اور ثبوت ہوتا ہے جو آنے والی دنیا میں قائم ہونے جا رہی ہے۔ رسول اپنی قوموں کو جب اپنی دعوت کے رد کرنے کے انجام سے تنبیہ یا انذار کرتے ہیں تو اس میں جہنم کے عذاب کے ساتھ دنیا کا یہ عذاب بھی شامل ہوتا ہے۔ جبکہ خاص اپنے مخاطبین کے لیے ان کی بشارت جنت

کے ساتھ دنیوی پہلو سے اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ ان پر ایمان لانے والے ہی اس عذاب سے بچائے جائیں گے اور وہی زمین کے وارث بنائے جائیں گے۔

چنانچہ رسولوں کی اقوام کی یہ سزا و جزا رسولوں کی صداقت اور اخروی انذار و بشارت کا وہ ثبوت ہوتی ہے جس سے بڑا کوئی ثبوت اس دنیا میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر ہم نے دلائل پر گفتگو کرتے ہوئے تفصیل سے بات کی ہے۔ تاہم باقی انسانوں کے لیے یہ دنیا دارالامتحان ہی ہے اور ان کی سزا و جزا کا اصل وقت ان کی موت کے بعد آنے والی دنیا میں شروع ہوگا۔

انذار و تبشیر کی اہمیت

یہ انذار و تبشیر دعوت عبادت رب کے بعد نبیوں کا سب سے اہم اور بنیادی کام ہے۔ یہ انذار و تبشیر ایک طرف تو دین کی بنیادی دعوت کا ایک لازمی جز ہے کہ دین دراصل اُسی آنے والی دنیا کے تعارف کے لیے آیا ہے جہاں خداوند دو عالم غیب کا نقاب اتار کر اپنی ذات وصفات کا حقیقی ظہور کرے گا۔ دوسری طرف دلائل کی طرح یہ انذار و تبشیر بھی ایک بندہ مومن کو ایمان و اخلاق کی مشکل شاہراہ کو اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور ایک منکر کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اگر باز نہ آیا تو آنے والی دنیا میں اس کو بدترین انجام کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عالمگیریت کو واضح کیا گیا ہے وہاں انذار و تبشیر کے الفاظ ہی استعمال کیے گئے ہیں۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو لوگ خود کو تفقہ فی الدین کے بعد خدمت دین کے لیے وقف کر دیں، ان کی ذمہ داری بھی یہی بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی قوم کو انذار کریں۔

قرآن مجید موت کے بعد سزا و جزا کے ان احوال و مقامات کو جن عنوانات سے زیر بحث لاتا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

۱) موت اور برزخ

۲) احوال قیامت

۳) سزا جزا کے مقامات: حشر، جنت، جہنم

ان عنوانات پر ایک ایک کر کے تفصیلی گفتگو انشاءاللہ العزیز آگے کی جائے گی۔

قرآنی بیانات

''ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم پورا پورا اجر تو بس قیامت ہی کے دن پاؤ گے۔ پس جو دوزخ سے بچایا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب رہا اور یہ دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے۔'' (ال عمران 185:3)

اس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تا کہ تمہارا امتحان کرے کہ تم میں کون سب سے اچھے عمل والا بنتا ہے۔ اور وہ غالب بھی ہے اور مغفرت فرمانے والا بھی، (ملک 2:67)

ہر جان کو موت کا مزہ لازماً چکھنا ہے۔ اور ہم تم لوگوں کو دکھ اور سکھ دونوں سے آزما رہے ہیں پرکھنے کے لیے اور ہماری ہی طرف تمہاری واپسی ہونی ہے۔ (الانبیا 35:21)

''لوگ ایک ہی امت بنائے گئے، (انہوں نے اختلاف پیدا کیا) تو اللہ نے اپنے انبیاء بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے۔''، (البقرہ 213:2)

''ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بھیجا ہے، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر، اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا ہو۔''

اور ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں، (سبا 28:34)

بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر حق و باطل کے درمیان امتیاز کر دینے والی کتاب اتاری تا کہ وہ اہل عالم کے لیے ہوشیار کر دینے والا بنے، (فرقان 1:25)

''یہ تو نہ تھا کہ سب ہی مسلمان اٹھتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ کچھ لوگ نکلتے تا کہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو بھی آگاہ (انذار) کرتے جب کہ وہ ان کی طرف لوٹتے کہ وہ بھی احتیاط کرنے والے بنتے۔'' (التوبہ 122:9)

جاوید چوہدری

ہے سے تھے

جج صاحب صبح جلدی عدالت پہنچ جاتے تھے، سات بجے کام شروع کر دیتے تھے اور شام تک مصروف رہتے تھے، وہ جمعرات 16 مارچ کی صبح بھی پونے سات بجے عدالت پہنچ گئے اور مقدمات کی سماعت شروع کر دی، وکیل جرح کر رہے تھے اور وہ وکیلوں کے دلائل سن رہے تھے، سات بج کر سات منٹ پر جج صاحب کے سینے میں شدید درد اٹھا اور وہ چند سیکنڈ میں پسینے میں بھیگ گئے، انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ دل پر رکھا اور سر میز پر ٹکا دیا، عدالت میں سراسیمگی پھیل گئی، وکلا خاموش ہو گئے، عدالتی عملے نے بھاگ کر جج صاحب کو سیدھا کیا، وہ پسینے میں شرابور تھے اور اونچی اونچی سانسیں لے رہے تھے، عملے نے پانی پلانے کی کوشش کی لیکن وہ پانی پینے کے قابل نہیں تھے، عدالت کے ایک کونے سے آواز آئی ''جج صاحب کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے' آپ انہیں جلدی سے اسپتال پہنچاؤ'' یہ آواز فیصلہ کن ثابت ہوئی' عملے نے انہیں اٹھایا' گاڑی میں ڈالا اور گاڑی اسپتال کی طرف دوڑا دی' سول اسپتال قریب تھا' جج صاحب کو اسپتال پہنچا دیا گیا' ڈاکٹر جمع ہوئے' ابتدائی طبی امداد دی گئی لیکن جج صاحب کا وقت آ چکا تھا یا پھر دیر ہو چکی تھی' ان کا دل بند ہو گیا اور سانسیں رک گئیں' ڈاکٹروں نے دل کو جھٹکے دیئے' انجکشن بھی لگایا مگر وہ زندگی کی سرحد سے بہت دور جا چکے تھے' وزیراعلیٰ نے اپنا خصوصی ہیلی کاپٹر بھجوایا' ان کا جسد خاکی ہیلی کاپٹر میں رکھا گیا اور میت کراچی پہنچا دی گئی۔

یہ جج صاحب جسٹس سعید الدین ناصر تھے' یہ سندھ ہائی کورٹ کے معزز جج تھے' یہ چھ مارچ 2017ء سے حیدر آباد کے سرکٹ بینچ میں شامل تھے' یہ کراچی میں رہتے تھے لیکن مقدمات کی سماعت کے لیے یکم اپریل تک حیدر آباد میں مقیم تھے' یہ صبح جلدی کام شروع کر دیتے تھے' یہ 16

مارچ کی صبح عدالت گئے' پہلا کیس شروع کیا' سماعت کے دوران ہارٹ اٹیک ہوا اور یہ چند منٹوں میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے' مقدمے' فائلیں' وکیل اور فیصلے پیچھے رہ گئے اور یہ چند لمحوں میں مائی لارڈ سے مرحوم مائی لارڈ بن گئے' یہ ''ہے سے تھے'' ہو گئے' جسٹس سعید الدین ناصر دنیا کی اس اٹل ترین حقیقت کا تازہ ترین ثبوت ہیں جسے ہم روز فراموش کر دیتے ہیں' جسے ہم روز زندگی کے فریب' زندگی کے رنگوں میں بھول جاتے ہیں' وہ حقیقت موت ہے' زندگی بہت مکار ہے' یہ ہمیں یاد ہی نہیں رہنے دیتی ہم نے کبھی مرنا بھی ہے' ہماری موت ہر وقت ہمارے گرد منڈلاتی رہتی ہے' یہ ہمیں کسی لمحے ڈس لے گی زندگی ہمیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی' زندگی اور موت بھی کیا دلچسپ کھیل ہے' مرد کے ایک اختلاط کے دوران 30 کروڑ سپرم خارج ہوتے ہیں' یہ 30 کروڑ سپرم مکمل انسان ہوتے ہیں' عام نارمل مرد میں پانچ ہزار اختلاط کی صلاحیت ہوتی ہے' آپ پانچ ہزار کو 30 کروڑ سے ضرب دیں آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے کہ قدرت نے ایک مرد کو دنیا کی کل آبادی سے دگنے بچے پیدا کرنے کی صلاحیت دے رکھی ہے لیکن ان اربوں سپرمز میں سے صرف دو چار حد آٹھ دس سپرم انسانی شکل اختیار کرتے ہیں' ان تیس کروڑ انسانوں میں سے صرف ہم پیدا ہو جاتے ہیں' ہماری پیدائش قدرت کے دس عظیم معجزوں میں سے ایک معجزہ ہے' ہماری تخلیق کے پہلے لمحے کے دوران ہمارے اردگرد 30 کروڑ بہن بھائی موجود ہوتے ہیں' یہ خوبصورتی' طاقت' ذہانت اور قسمت میں ہم سے بہتر ہوتے ہیں لیکن قدرت عین وقت پر ہمارے حق میں فیصلہ دے دیتی ہے اور یوں ہم ماں کی کوکھ میں بیج بن جاتے ہیں' یہ ہماری زندگی کے سفر کی شروعات ہیں' آپ آگے کا سفر بھی ملاحظہ کیجیے' دنیا میں ہر سال لاکھوں بچے پیدائش سے پہلے مر جاتے ہیں' یہ ''مس کیرج'' ہو جاتے ہیں' قدرت ہمیں مس کیرج سے بھی بچا لیتی ہے' دنیا کے 80 فیصد معذور بچے پیدائش کے دوران معذور ہوتے ہیں'

بچے کو ڈیلیوری کے دوران آکسیجن نہیں ملتی‘ سردی یا گرمی لگ جاتی ہے‘ دائی کا ہاتھ سخت ہو جاتا ہے‘ ڈیلیوری کے دوران بچے کے سر پر چوٹ لگ جاتی ہے یا پھر ماں ’’گھٹی‘‘ کے نام پر اسے کوئی ایسی چیز کھلا دیتی ہے جسے بچے کا جسم قبول نہیں کرتا اور یوں یہ بے چارہ عمر بھر کے لیے معذور ہو جاتا ہے‘ قدرت ہمیں معذوری سے بھی بچا لیتی ہے‘ دنیا کے لاکھوں بچے ابتدائی پانچ برسوں میں فوت ہو جاتے ہیں‘ یہ خوفناک امراض کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں‘ پاکستان میں اڑھائی کروڑ بچے اسکول کی نعمت سے محروم ہیں‘ پاکستان دنیا کے ان ملکوں کا حصہ ہے جن میں ’’ڈراپ آؤٹ‘‘ کی شرح انتہائی بلند ہے‘ ہمارے آدھے بچے پرائمری سے مڈل میں نہیں جاتے‘ مڈل میں داخل ہونے والے آدھے بچے ہائی اسکول نہیں پہنچ پاتے‘ آپ تعلیم کا المیہ دیکھئے‘ ہمارے سو بچوں میں سے صرف تین یونیورسٹی پہنچتے ہیں‘ پاکستان میں اس وقت ستر لاکھ لوگ نشے کے شکار ہیں‘ نشیوں کی اکثریت جوانی میں اس لت کا شکار ہوئی‘ دنیا میں سب سے زیادہ روڈ ایکسیڈنٹ پاکستان میں ہوتے ہیں‘ ہم ناخالص خوراک بیچنے والے ملکوں میں بھی شمار ہوتے ہیں‘ ہمارے ملک میں ادویات‘ پانی اور ہوا بھی خالص نہیں ملتی‘ ہم مہلک بیماریوں کے سینٹر میں بھی رہتے ہیں‘ ہم ہیپاٹائٹس سی میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہیں‘ ہم شوگر کے مرض میں دنیا میں چوتھے نمبر پر ہیں‘ ہمارے ملک میں تھیلیسیمیا‘ ٹی بی اور کینسر بھی خطرے کی لکیر سے اوپر ہیں‘ پاکستان دہشت گردی کے شکار تین بڑے ملکوں میں بھی شمار ہوتا ہے‘ ہمارے ستر ہزار لوگ دہشت گردی کا لقمہ بن چکے ہیں اور ہم فرقہ واریت کے شکار ملکوں میں بھی شمار ہوتے ہیں چنانچہ آپ کبھی غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک ہمارا وجود ہر لحظہ خطرے کا شکار رہتا ہے اور یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو ہمیں بیماریوں سے لے کر ڈراپ آؤٹ اور نوکری سے لے کر دہشت گردی سے بچاتی رہی‘ یہ اللہ کا کرم ہے جس کے صدقے ہم پیدا بھی ہوئے‘ صحت

مند بھی رہے‘ تعلیم بھی حاصل کی‘ ترقی بھی کی‘ بیماریوں‘ حادثوں اور دہشت گردی سے بھی بچے اور ہم قدرتی آفات سے بھی محفوظ رہے‘ یہ سب اللہ کا کرم‘ اللہ کی مہربانی ہے‘ ہم اللہ کے اس کرم پر جتنا شکر ادا کریں کم ہو گا‘ ہم اللہ کی اس مہربانی پر جتنا سیدھا چلیں وہ بھی کم ہو گا لیکن انسان بدبخت بھی کیا چیز ہے؟ ہم احسان فراموش اور کمینے ہیں‘ ہم اللہ کی اس مہربانی کو ’’فار گرانٹڈ‘‘ لیتے ہیں‘ ہم مہلت کو اپنا حق سمجھ لیتے ہیں‘ ہم خود کو خدا سمجھ بیٹھتے ہیں‘ میں نے زندگی میں بے شمار جھوٹے خدا دیکھے ہیں۔ میں آج بھی ہزاروں جھوٹے خدا دیکھتا ہوں‘ یہ جھوٹے خدا دکاندار سے لے کر جج اور ایس ایچ او سے لے کر وزیراعظم تک ملک کی ہر کرسی‘ ہر گدی پر بیٹھے ہیں‘ آپ کسی دن ان خداؤں کی نخوت‘ ان کا غرور‘ ان کا تکبر اور ان کے پتھریلے لہجے دیکھیں اور پھر ان کی اوقات پر نظر ڈالیں‘ آپ کو ان پر ترس آئے گا‘ یہ خدا یہ بھول جاتے ہیں کہ موت روزانہ 65 بار ان کے قریب سے گزرتی ہے‘ ڈرائیونگ کے دوران اگر ڈرائیور کو نیند یا چھینک آ جائے تو یہ خدا کہاں ہوں گے‘ پانی کا آدھا قطرہ یا چاول کا ایک دانہ ان کی سانس کی نالی میں چلا جائے‘ اٹھتے ہوئے ان کا گھٹنا ان کا بوجھ نہ اٹھائے اور یہ شیشے کی میز پر گر جائیں‘ ان کے سر پر گائے سوپ کا سائن بورڈ گر جائے‘ ان کی گاڑی کا انجن لاک ہو جائے‘ ان کے کچن کی گیس لیک ہو جائے‘ ان کی چائے میں چھپکلی گر جائے یا پھر رات سوتے وقت ان کا پنکھا ان کے اوپر گر جائے تو یہ اور ان کی خدائی کہاں جائے گی؟ یہ لوگ کبھی یہ نہیں سوچتے‘ ہم اگر یہ سوچ بھی لیں‘ ہم اگر ان سارے حادثوں سے بچ بھی جائیں تو بھی ہم موت کے ساڑھے چار ہزار بہانے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں‘ ہمارے خلیوں میں ساڑھے چار ہزار بیماریاں موجود رہتی ہیں‘ ان میں سے کسی بھی وقت کوئی بھی ایکٹو ہو جاتی ہے اور ہم کرسی پر بیٹھے بیٹھے ’’ہے سے تھے‘‘ ہو جاتے ہیں‘ ہم آنجہانی یا مرحوم ہو جاتے ہیں اور ہمارے بعد ہماری کرسی‘ ہماری گدی اور ہماری مسند پر کوئی دوسرا خدا بیٹھ

جاتا ہے اور بات ختم۔

میں روز اخبارات کھولنے کے بعد سب سے پہلے انتقال کی خبریں پڑھتا ہوں، میں اس کے بعد حادثوں کی خبریں پڑھتا ہوں اور پھر اپنے آپ سے پوچھتا ہوں ''یہ لوگ بھی کل تک زندہ تھے، یہ لوگ بھی کل تک امیر، طاقتور، خوبصورت، متحرک اور عقل مند تھے لیکن یہ آج کہاں ہیں'' میں اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور پھر مزید ایک دن کی مہلت ملنے پر اس کا شکر ادا کرتا ہوں، یہ شکر اور یہ توبہ میری روز کی عبادت، میرا روز کا معمول ہے، کاش ہم سب اللہ کی مہلت پر شکر اور توبہ کو اپنا معمول بنالیں، کاش ہم یہ جان لیں وہ اللہ جو کرسی پر جسٹس سعید الدین ناصر کی جان قبض کر سکتا ہے وہ ہمیں بھاگنے کا موقع کہاں تک دے گا، وہ ہمیں مزید کتنا وقت دے گا تو شاید ہماری یہ عارضی زندگی بہتر ہو جائے، ہم شاید تکبر اور لالچ سے بچ جائیں چنانچہ میری آپ سے درخواست ہے اللہ سے توبہ کریں، شکر ادا کریں، روز ایک نیکی کریں اور روز ایک گناہ، ایک کوتاہی ترک کرنے کا عزم کریں شاید اللہ تعالیٰ کو ہم پر رحم آجائے، شاید یہ ہماری زندگی کو بابرکت بنادے، شاید یہ ''تھے'' سے پہلے ہمارے ''ہے'' کو اچھا بنادے۔

(بشکریہ: روزنامہ ایکسپریس)

زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حالات
روزے دار کے ایک سخت دن کی طرح
آخر کار گزر جاتے ہیں

ڈاکٹر محمد عقیل

عمل سے شکر ادا کیسے کیا جاتا ہے

ہم دلی طور پر شکر کرنے کو اور اسے زبان سے ادا کرنے کو تو جانتے ہیں لیکن عمل سے شکر ادا کرنے سے کیا مراد ہے؟ عمل سے شکر ادا کرنے کے چار درجات ہیں۔

۔ پہلا درجہ یہ کہ ملنے والی نعمت کے تمام حقوق وفرائض ادا کرنا۔ یہ لازم ہے

۔ دوسرا درجہ یہ کہ حاصل شدہ نعمت کے حقوق ادا کرتے وقت اپنے موڈ، مزاج اور طبیعت کو قابو میں رکھ کر ہر حال میں حقوق ادا کرنا۔

۔ تیسرا درجہ یہ کہ نعمت سے متعلق حقوق کی ادائیگی میں اپنی پسند و ناپسند کو ختم کر کے صرف نعمت کے مالک کی مرضی کا خیال رکھنا۔

۔ چوتھا مرحلہ یہ کہ حاصل شدہ نعمت کو بلا تفریق مخلوق میں تقسیم کرنا۔

۔ پہلا درجہ ۔ نعمت کے حقوق وفرائض ادا کرنا

یہ عملی شکر گذاری کا پہلا درجہ ہے۔ جو بھی نعمت ملے اس کو اس کے اصل مالک وخالق یعنی خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا اس کا پہلا حق ہے۔ چنانچہ آنکھوں کی نعمت کی پہلی شکر گزاری یہ ہے کہ اسے ان کاموں میں استعمال کیا جائے جہاں استعمال کرنا جائز ہے۔ فحش مناظر دیکھنے میں آنکھوں کو لگانا اس نعمت کی ناشکری اور اس کے حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ زبان کا شکر یہ ہے کہ اسے لوگوں کو دکھ پہنچانے کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ اسی طرح رزق یا دولت اگر ملے تو اس کا شکر یہی ہے کہ اسے اپنے اوپر اور اپنے بیوی بچوں اور متعلقین پر جائز طریقے سے خرچ کیا جائے اور اسراف یا ناجائز مصارف پر خرچ کرنے سے گریز کیا جائے۔

۔ دوسرا درجہ ۔ مزاج کو تابع رکھنا

پہلا درجہ تو یہ تھا کہ اس نعمت کو مالک کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جائے۔ عام حالات میں تو ایسا کرنا مشکل نہیں ہوتا اور عمومی حالات میں نعمتیں اپنے جائز محل ہی میں استعمال ہو رہی ہوتی ہیں۔ لیکن قدم قدم پر ایسے حالات پیش آتے ہیں جب نعمت کا حق ادا کرنا یعنی اس کو جائز طور پر استعمال کرنا مشکل ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض اوقات ٹی وی اسکرین پر ایسے مناظر بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں جن کا دیکھنا جائز نہیں۔ یا بعض اوقات چیزوں کی چمک دمک اسراف پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں اپنی طبیعت، مزاج، موڈ یا نفس کو قابو کر کے نعمت کا حق ادا کرنا یعنی اسے مالک کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا شکر گذاری کا دوسرا درجہ ہے۔

یعنی اس مرحلے میں معاملہ یہ ہے کہ حالات کے دباؤ اور لالچ کے باوجود اپنے نفس اور موڈ پر قابو رکھا جائے۔ نگاہوں کو اس وقت بھی قابو رکھا جائے جب فحش منظر پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے ہو، مال اس وقت بھی حلال کمایا جائے جب بیوی بچوں کے تقاضے عروج پر ہوں وغیرہ۔

۔تیسرا درجہ۔ اپنی پسند و ناپسند کو ختم کر دینا

اوپر کے دو درجات تو شکر گذاری کے لیے لازمی ہیں۔ البتہ نعمت کے استعمال میں ایک در جہ یہ بھی ہے کہ انسان مکمل طور پر اپنی پسند و ناپسند سے دست بردار ہو جائے اور اس نعمت کو کامل طور پر مالک کی پسند کے تحت استعمال کرے۔ یہ درجہ لازم نہیں بلکہ عزیمت کا درجہ ہے۔ اس درجے میں بعض اوقات انسان نعمتوں کے جائز استعمال سے بھی خدا کے حکم کے تحت خود کو دور کر لیتا ہے۔

مثال کے طور پر ابراہیم علیہ السلام کو اولاد کی نعمت ملتی ہے لیکن وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں اسے قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ انہیں ایک خاندان کی نعمت ملتی ہے لیکن وہ حضرت حاجرہ

اور اسماعیل علیہما السلام کو مکہ میں بسا کر چلے جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پر آسائش زندگی میسر تھی لیکن آپ خدا کے حکم کی تعمیل میں دولت اور پر آسائش زندگی چھوڑ کر دعوت حق بلند کرتے ہیں، گالیاں سنتے، تشدد برداشت کرتے، طعن و تشنیع کا سامنا کرتے اور بالآخر اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں۔

عام انسانوں کے لیے یہ مرحلہ اس وقت آتا ہے جب خدا کا حکم پورا کرنے میں کوئی بہت بڑی نعمت کی قربانی دینی پڑ رہی ہو۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ والدین کی رضامندی اور خوشی کے لیے اپنی محبت کی قربانی دے دیتے ہیں، کچھ بہنوں کی شادی کرانے میں ساری عمر کی کمائی داؤ پر لگا دیتے ہیں، کچھ دوسروں کو بچانے میں اپنی جان قربان کر دیتے ہیں وغیرہ۔

۔چوتھا درجہ۔ حاصل شدہ نعمت سے فیض پہنچانا

عملی شکر گذاری کا آخری درجہ یہ ہے کہ جو نعمت حاصل ہے اس کو صرف بیوی بچوں، ماں باپ اور قریبی لوگوں تک ہی محدود نہ رکھے بلکہ اس کا فیض دیگر لوگوں تک بھی پہنچائے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو اگر مال کی نعمت ملی ہے تو وہ ضرورت سے زائد مال کو خدا کے بندوں میں تقسیم کرے، علم کی نعمت سے لوگوں کو بہرہ مند کرے، صحت ہے تو بیماروں کی مدد کرے، آسانی ہے تو مشکل میں گھرے لوگوں کو آسانیاں فراہم کرے، آنکھیں ہیں تو نابینا کی مدد کرے۔ یہ فیض ہر شخص کے لیے ہوگا جو اس کے رابطے میں آ جائے یا مدد کی درخواست کرے۔

چنانچہ اس مرحلے پر ایک شخص سخاوت کے دروازے کھول دیتا اور اپنی ضرورت سے زائد ہر شے کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتا ہے۔ ایک شخص علم کے فروغ کے لیے اپنی جان کھپا دیتا ہے، ایک شخص لوگوں کی مدد کے لیے دن اور رات کی پروا نہیں کرتا۔

درجہ بندی کی اہمیت

عام طور پر کچھ لوگ درجہ بندی کی اس ترتیب کو مدنظر نہیں رکھتے اور وہ آخری درجے میں چھلانگ لگانا چاہتے ہیں۔ یعنی ایک شخص کو مال ملے تو وہ اپنے بیوی بچوں کا حق بھی بعض اوقات غربا میں تقسیم کر دیتا، تبلیغ کے نام پر بیوی بچوں کو چھوڑ کر بیابانوں میں دعوت دیتا رہتا ہے۔ یہ عمل شکرگذاری نہیں بلکہ ناشکری ہی ہے کیونکہ اس طرح ہم ملنے والی نعمت کا بنیادی حق تو ادا نہیں کر پاتے اور ثانوی حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شکرگذاری اور ناشکری کی چند مثالیں

۔علم کی ناشکری یہ ہے کہ تکبر کیا جائے، اس سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے، اس سے لوگوں کو حقیر ثابت کیا جائے، اس سے لوگوں پر اپنی دھونس جمائی جائے، اس کو بلاوجہ اپنی ذات تک محدود کرلیا جائے۔

۔مال کی ناشکری یہ ہے کہ تکبر کیا جائے، اسراف کیا جائے، کنجوسی کی جائے، اسے ناجائز کاموں میں استعمال کیا جائے، اسے بالکل ہی استعمال نہ کیا جائے، اسے بے دریغ استعمال کیا جائے، اسے صرف اپنی ذات یا اپنے بیوی بچوں تک ہی محدود رکھا جائے۔

خلاصہ

شکرگذاری اگر صرف زبان سے ہو اور عمل میں اس کا اظہار نہ ہو تو یہ منافقت ہے۔ شکر گذاری کا پہلا درجہ یہ ہے کہ نعمت کو خدا کے بیان کردہ جائز و ناجائز حدود میں استعمال کیا جائے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ حق ادا کرنے میں نفس اور طبیعت کو قابو میں رکھا جائے، تیسرا درجہ یہ ہے کہ نعمت سے دوسروں کو بھی فیض پہنچایا جائے اور آخری درجہ یہ ہے کہ اپنی پسند و ناپسند کو ختم کر کے صرف خدا کی پسند ہی کا خیال رکھا جائے۔

فرح رضوان

باغبانی اور انسانی تربیت

ہمارے بچپن میں جب ہمارے مکان کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں تب امی نے فرنٹ اور بیک یارڈ میں مختلف اقسام کے پودے لگوائے تھے۔ وقت گذرتا رہا۔ مکان بنتا رہا۔ پودے بڑھتے رہے اور جب ہم نئے گھر میں ذرا ہوش سنبھالا تو الحمدللہ ہر سو ہریالی تھی۔

مجھے لگتا ہے کہ اس دور میں جہاں گھر کا رقبہ سکڑتا ہوا فلیٹوں کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے وہاں بھی چھوٹے بڑے گملوں میں جو کچھ بھی اگایا جا سکے ضرور اگانا چاہیے کیونکہ یہ عمل بچوں کو کسی کمزور کا دھیان رکھنے کے اسباق ذہن میں پختہ کر دیتا ہے۔

آج کل واک پر نکلیں تو ہر سو گھنے درخت جھوم جھوم کر رب تعالیٰ کی ثنا بیان کرتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر خدا کی ربوبیت پر ایمان مستحکم ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ تناور درخت فقط ایک کونپل تھے۔ مگر یہ اللہ ہی ہے جس نے ان کو ہر چرند پرند کے نقصان سے محفوظ رکھا۔ ان درختوں پر کتنی خزاں گزریں، لیکن ان کی نشو ونما نہیں رکی۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔

جب ہم نے سکول جانا شروع کیا تو مالی بابا صبح صبح ہمارے لان سے چنے ہوئے پھولوں سے سکول جانے والے ہم دونوں بھائی بہن کو خوشبودار گلدستے تھما دیتے۔ ہمیں ٹیچر اور پرنسپل سے بڑی پذیرائی ملتی۔ چھٹیوں میں موگرے کے سینکڑوں پھول ہر روز توڑنا ہم دونوں بڑے بھائی بہن کے ذمے تھا۔ جب ہر روز صبح صبح ہم دونوں بھائی بہن تازہ پھولوں کی ٹوکری لے کر تھوڑے تھوڑے پھول محلے کے سب گھروں میں دے کر آتے تو دعا سلام، خیریت و محبت اور دعاؤں کے تبادلے ہوتے، بے لوث محبتیں روح میں اتر جاتیں۔

صبح جلد اٹھنے کا سبق بھی ہم نے ایسے سیکھا کہ دو ایک بار سوتے رہے اور علی الصباح پھول

نہیں توڑ سکے۔ ذرا ہی دیر میں سخت گرمی سے ہم جھلسنے لگے اور دوپہر تک پھول مرجھا گئے۔ یوں یہ دن کسی کو خوش کر دینے اور دعائیں لینے والا دن نہ رہتا اور دوسرا تازہ پھول جب دیئے نہیں گئے تو کسی کام کے نہ رہے۔ جب وہ نہیں توڑے گئے تو ان کے پیچھے جن پھولوں کو آنا تھا ان کا حق مارا گیا۔ اس کا براہ راست اثر پودے پر پڑا۔ جیسے اکثر ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ حق دار کی باری نہیں آتی اور ادارے بیٹھ جاتے ہیں۔ بہر حال کس طرح کانٹوں سے بچ بچا کر زندگی میں پھول چنے جا سکتے ہیں، کیسے ان کی نشونما کے لیے وقتی طور پر کھاد کی بو برداشت کرنی ہی پڑتی ہے ہم سب ساتھ ساتھ سیکھتے گئے۔

فالسے، امرود، پپیتے، کیلے، آم، لیموں، انار کے جھاڑ اور درختوں پر جب پھل لگتے تو کوئی بھی اس ''جنت'' کے پھل بلا اجازت نہیں کھا سکتا تھا۔ امی کو بتایا جاتا اور وہ ہمیں بتاتیں کہ تقریباً اتنے دن میں یہ بڑا ہوگا۔ ان کے متعلق مالی بابا سے بات ہوتی تو ہم سیکھتے کہ پھل میٹھا کرنا ہو یا درخت بڑا چاہتے ہو تو ان میں سے کوئی کام بھی پھل اور پتوں پر پانی ڈال کر نہیں ہوگا بلکہ جڑوں سے ہوگا۔ ان بے رنگ بدمزہ جڑوں کی خدمت کے صلے میں تازے رسیلے پھل مل سکیں گے۔

امی کبھی ہماری ضد پر کچا پھل توڑ کر دے دیتیں اور ہم تھوتھو کر کے چکھتے تب سبق پکا ہو جاتا کہ واقعی ''صبر کا پھل ہی میٹھا ہوتا ہے''۔

آم کا درخت پانچ سال سے قبل پھل نہیں دے سکتا اور شروع میں بڑے بڑے پھل بھی نہیں دے سکتا یعنی کسی کی طاقت اور صلاحیت سے بڑھ کر نہ اس سے توقع کی جائے نہ ہی عار دلایا جائے۔ ایک اور صبر آزما مرحلہ، گھر کے درختوں سے کچے کیلے اور بازار سے کچے آموں کو لے کر پال لگانا؛ امی ان کو پرانے صندوق میں اخبار میں لپیٹ کر رکھتیں، اور ہم ہر روز ان کو یاد دلا کر

پوچھتے پک گئے اور جواب ملتا صبر کا پھل۔۔۔۔ جب مقرّرہ وقت پر پیٹی کھلتی تو میٹھے پھلوں کی مہک سے ماحول تروتازگی اور خوشبو سے جی اٹھتا۔۔۔۔

بیچ کے ایک حصے میں سبزیوں کی کیاریاں تھیں؛ محلے والے اکثر شام میں ہمارے گھر سے سبزی لے لیا کرتے۔ مگر کچھ کم نہ ہوتا، اللہ تعالیٰ اور دے دیتا دُگنا چوگنا۔ امجد اسلام امجد صاحب نے صرف محبت کے بارے میں فرمایا ہے کہ ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے تو یہ سوکھا نہیں کرتا۔ ہوسکتا ہے ان کے گھر میں پالک کی کاشت نہ ہو! کیونکہ لوگ ہمارے گھر سے خوب خوب پالک کاٹ کر لے جاتے، لیکن وہ پھر سے ویسی ہی پھل پھول جاتی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

پھر ایک دفعہ سیلاب آ گیا۔ ہمارا سارا شہر ڈوب گیا۔ روڈ پر کاروں کی جگہ کشتیاں چلنے لگیں۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں یہ بہت ہی بڑا تجربہ تھا۔ سب کچھ ختم۔۔۔۔ سب برباد ہو گیا۔ زمین میں تھور آ گیا تھا۔ لگتا تھا اب کچھ بھی نہیں اُگ سکے گا۔ بہار لوٹ آئے تب بھی گلشن میں رنگ و بو کا میلہ اور ہر دم قسم قسم کی چڑیوں کی آمدورفت چہل پہل نہ رہے گی، لیکن انسان کے دو تین وصف یعنی ہمت، تدبیر، عزم؛ سب مل جل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اور مسلمان کے ساتھ تو سب سے بڑا عنصر دعا اور صبر کے ساتھ استقامت بھی ہوتی ہے۔ اب کی بار امی نے نیا کام کیا، فرنٹ یارڈ کو گاؤں کے کچے صحن کی طرح بنایا، بہت لمبا کام تھا لیکن ہم نے خود سب کچھ کیا اور بہترین نتیجہ پایا الحمدللہ۔ بیک یارڈ جو اس سے کافی بڑا تھا اس میں گنّے لگائے گئے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تھور زدہ زمین پر نہ صرف پنپ جاتے ہیں، بلکہ اسکا نمک بھی ختم کر دیتے ہیں۔ زندگی کے یہ گر بھلا کس یونیورسٹی سے سیکھنے کو مل سکتے ہیں جو قدرت ہمیں سکھلاتی ہے۔ اور قدرت کے انمول تحائف میں سب سے انمول پرحکمت ماں اور باپ کا ٹیم ورک۔ **رب ارحمھما کما ربینی صغیرا**

شہزاد سلیم

روحانی طور پر مفلس

ہم میں سے روحانی طور پر مفلس وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ مال و دولت سے نوازتے ہیں تا کہ وہ اس کا کچھ حصہ دوسروں میں بانٹ سکیں لیکن وہ ایسا نہیں کرتے۔ ایسے لوگ مادی طور پر تو امیر ہو سکتے ہیں لیکن روحانی طور پر وہ غریب ہی رہتے ہیں۔

بخل انسان کی سب سے بدترین خصلتوں میں سے ایک ہے۔ یہ خصلت انسان کو دوسروں کی ضروریات سے بے پروا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے اس رویہ کا اثر اس کے قریبی اعزاء پر بھی پڑتا ہے۔ ایک بخیل شخص کبھی بھی اپنا مال دوسروں پر خرچ نہیں کرنا چاہتا، چاہے کسی کی ضرورت کتنی ہی بڑی ہو۔ وہ نہ صرف خود بخیل ہوتا ہے بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے بھی بخیل بن جائیں تا کہ کوئی اس کو بخیل نہ کہے۔ یہ ایک قابلِ مذمت نفسیات ہے۔

لیکن ہمیں اس حقیقت کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ مال و دولت ہمیشہ کے لیے اپنی تجوریوں میں محفوظ کرنے کے لیے نہیں دیا ہے۔ جو ہم خرچ کرتے ہیں وہی دراصل ہمارا حقیقی سرمایہ ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہم جمع کرتے ہیں وہ صرف اس دنیا کی زندگی تک ہی ہمارے ساتھ رہتا ہے۔

بخل کا مرض اتنا شدید ہے کہ انسان کو خدا کی زبردست گرفت کا شکار بنا سکتا ہے۔ اس سے بچنے کی کوشش کرنا ہر باشعور مسلمان کی پہلی ذمہ داری ہے۔ اس کا سب سے بہتر ذریعہ قرآن مجید کی تلاوت ہے جس میں بخل کی اس برائی کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے اور اس کی شناعت کو واضح کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ قرآن کا مطالعہ ہمیں اس مرض سے محفوظ رکھنے میں مدد کرے گا۔

(ترجمہ: محمود مرزا)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (44)

اسحاق پاشا کا محل

کوہ ارارات کا نظارہ دور سے ہی ممکن تھا کیونکہ اس کے بیس کیمپ تک جانے کے لئے بھی انسان کو کوہ پیما ہونا ضروری تھا۔ ہم لوگ ایک ہوٹل کے قریب رکے۔ یہاں کئی بسیں رکی ہوئی تھیں جن میں سے ایرانی زائرین نکل نکل کر آ رہے تھے۔ غالباً یہ لوگ شام کی طرف زیارتوں کے سفر کے لئے جا رہے تھے۔

اب ہم ڈوغو بایزید شہر میں داخل ہو گئے۔ یہاں ایک طویل بازار تھا۔ ہم لوگ اسحاق پاشا کا محل دیکھنا چاہتے تھے۔ جگہ جگہ "اسحاق پاشا سرائے" کی طرف جانے کے لئے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ یہ کوئی سرائے ہو گی مگر ایسا نہ تھا۔ ترکی زبان میں محل کو سرائے کہا جاتا ہے۔ شاید اسی سے اردو میں محل سرا کی ترکیب پیدا ہو گئی ہو گی۔ کچھ گلیوں سے گزر کر ہم شہر سے باہر جانے والی تنگ سی سڑک پر ہو لئے۔ کچھ دور جا کر کافی بلندی پر محل کے آثار نظر آئے جو کہ چمکتی دھوپ میں کافی خوبصورت محسوس ہو رہا تھا۔

محل کے نیچے ایک کیمپنگ ایریا بنا ہوا تھا جس میں ٹائلٹ اور بچوں کے لئے جھولوں کی سہولت موجود تھی۔ یہاں کچھ دیر رک کر ہم اوپر محل کے دروازے پر جا پہنچے۔ اتنی بلندی پر محل کی تعمیر کے لئے بہت محنت کرنا پڑی ہو گی۔ بہر حال یہ بادشاہوں کے کام تھے۔ عوام کے پیسے کو اس طرح کی عیاشیوں میں اڑانا ان کا مشغلہ رہا تھا۔

عثمانی دور کے گورنر عبدی پاشا نے یہ محل 1685ء میں تعمیر کروانا شروع کیا تھا۔ اس کے بعض سیکشن ان کے پوتے اسحاق پاشا نے 1784ء میں تعمیر کروائے تھے۔ محل کا دروازہ بہت ہی بلند

تھا۔محل میں اس دور کی تمام لگژری سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ایک طرف گورنر کا دربار تھا۔کھیل تماشوں کے لئے ہال الگ تھا۔مختلف قسم کے کھانے پکانے کے لئے علیحدہ کچن بنے ہوئے تھے۔ گورنر کے لئے حمام بنایا گیا تھا۔خواتین کے لئے حرم بنا ہوا تھا۔ان محلات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا تھے۔اس کی مزید تفصیل ہم استنبول کے باب میں بیان کریں گے۔

زرتشت کی دعوت

اس وقت ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے،صدیوں پہلے یہیں جناب زرتشت نے توحید اور انسانیت کی دعوت پیش کی۔ان کے بارے میں جو جدید تحقیقات ہوئی ہیں،ان کے مطابق زرتشت ایک خدا پر یقین رکھتے تھے۔ان سے پہلے مذہبی راہنماؤں نے عوام کا استحصال کرنے کے لئے بہت سی مذہبی رسومات ایجاد کر رکھی تھیں جن میں دیوی دیوتاؤں کے حضور قربانیاں پیش کرنا ضروری تھا۔یہ قربانیاں پروہتوں کے خزانے میں داخل ہو جایا کرتی تھیں۔قرآن مجید نے ان رسومات کو اصرار و اغلال سے تعبیر کیا ہے۔زرتشت نے بھی ان رسومات کی مخالفت کی۔

اس معاملے میں اختلاف ہے کہ زرتشت نبی تھے یا نہیں البتہ ان کی تعلیمات کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا جو انبیاء کرام علیہم السلام کے ادیان کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ان کی تعلیمات کو مسخ کر کے اس میں شرک کو داخل کر لیا گیا اور آگ کی پوجا کی جانے لگی۔ پورے ایران میں زرتشتی مذہب کو آتش پرستی کا مذہب قرار دے دیا گیا۔اس کی باقیات آج بھی پارسیوں کی شکل میں موجود ہیں۔عرب انہیں مجوسی کہا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرنے کا حکم دیا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید زرتشت اللہ کے نبی ہی ہوں گے جن کی تعلیمات کو ان کے پیروکاروں نے مسخ کر لیا۔

انسان کا روئے زمین پر پھیلاؤ

کچھ دیر محل دیکھنے کے بعد ہم نیچے اترے۔ نیچے شہر سے کھانا کھایا،کافی پی اور واپسی کے سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ہم اس وقت زمین کے اس حصے میں تھے جہاں سے پوری نسل انسانی روئے زمین پر پھیلی ہے۔جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ سیدنا نوح علیہ الصلوۃ والسلام کے تینوں بیٹوں کی نسل زمین کے تین مختلف علاقوں میں جا کر آباد ہوئی تھی۔حام کی نسل افریقہ میں، سام کی نسل دجلہ وفرات کی وادی میں اور یافث کی نسل آرمینیا کے علاقے میں۔

ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ یہ نسلیں مختلف علاقوں میں جا کر آباد کیوں ہوئیں۔قرآن مجید اور بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے انسانوں کی عمریں بہت طویل ہوا کرتی تھیں۔ ہزار برس کی عمر تو عام سی بات ہوتی تھی۔یقینی طور پر وہ لوگ بہت ہی مضبوط ہوں گے اور ان کے جسموں میں بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہو گی۔اگر کسی شخص کی ہزار سالہ عمر میں 15% بچپن اور اتنے ہی بڑھاپے کے سال فرض کر لیے جائیں تو جوانی کی عمر 700 برس بنتی ہے۔اگر اس شخص کی شادی 150 سال کی عمر میں کر دی جائے اور اس کے بعد اگلے 500 برس تک ہر سال ایک بچہ ہو تو صرف ایک انسانی جوڑے سے 500 بچے پیدا ہو سکتے تھے۔ ابھی یہ صاحب محض 300 برس کے کڑیل جوان ہی ہوں گے جب ان کی پہلی اولاد بھی شادی کر کے پرفارم کرنے کے لئے تیار ہو گی۔ان میں سے اگر نصف بچے مر مرا بھی جائیں تب بھی اس شخص کی زندگی ہی میں اس کی اپنی اولاد کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہو گی۔

پروین سلطانہ حنا

غزل

سلسلے بے کلی سے ملتے ہیں
دوست جب بے رخی سے ملتے ہیں

بے حقیقت نہ جانیے ان کو
غم بھی تو زندگی سے ملتے ہیں

لوحِ جاں پر جو جگمگاتے ہیں
زخم وہ آگہی سے ملتے ہیں

ہو مقدّر میں نارسائی تو
کب ستارے کسی سے ملتے ہیں

ہم میں طاقت نہیں جدائی کی
اس لیے کم کسی سے ملتے ہیں

دیکھ کر دلکشی گلابوں کی
یوں لگا آپ ہی سے ملتے ہیں

وہ ہی محور ہے میری سوچوں کا
دائرے سب اسی سے ملتے ہیں

مشکلوں سے نجات کے رستے
سب اسی کی گلی سے ملتے ہیں

ابویحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابویحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابویحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read all articles and books of Abu Yahya free online.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

Monthly
INZAAR

JUL 2017
Vol. 05, No. 07
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi